مذہب اور سائنس اقبال کی نظر میں

از

ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی

۱۹۶۸ء

مذہب اور سائنس اقبال کی نظر میں

(۱)

مذہب اور سائنس کا باہمی تعلق ایک عرصۂ دراز سے موضوع بحث رہا ہے۔ علم کی توسیع اور اشاعت کے ساتھ ساتھ یہ بحث جن اصولوں پر کی جاتی رہی ہے، وہ بھی بدلتے گئے ہیں اور اس وقت مسلم ممالک میں اس مسئلے پر کافی شدت کے ساتھ غور و خوض ہو رہا ہے کیونکہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے اس دور میں ملتِ اسلامیہ کی بقا اور نشاۃ ثانیہ کے لیے مذہب اور سائنس کے صحیح تعلق کو متعین کرنا بہت اہم اور ضروری سمجھا جاتا ہے۔ پیشِ نظر مضمون میں اس تعلق کے بارے میں علامہ اقبال کے خیالات کو پیش کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

طلوعِ اسلام سے قبل مذہبی پیشواؤں کی منظم کوشش تھی کہ عوام الناس کو پڑھنے لکھنے اور سوچنے سمجھنے سے باز رکھا جائے تاکہ وہ وہم اور جہالت میں مبتلا رہیں اور پیشواؤں کی گرفت ان پر مضبوطی سے قائم رہے۔ انھیں مسلسل ڈرایا جاتا تھا کہ اگر انھوں نے علم حاصل کرنے کی ذرا بھی کوشش کی تو سخت سزا اور عذاب کے مستحق ہوں گے۔ ان پیشواؤں نے چاند گرہن اور سورج گرہن جیسے مظاہرِ قدرت کو بھی سزا کی نشانی کے طور پر پیش کر کے عام لوگوں کو اپنی اطاعت اور فرمانبرداری پر مجبور کرنے کا ذریعہ بنا لیا تھا۔

لکھنے پڑھنے کے متعلق مذہبی پیشواؤں کی اس اجارہ داری اور عوام الناس کو جاہل رکھنے کی سازش کے برخلاف سب سے پہلا جہاد اسلام نے کیا اور اُمّتِ مسلمہ کے ہر فرد کو علم حاصل کرنے کی تاکید کی گئی۔ یہ حقیقت عام طور پر سب کو معلوم ہے کہ قرآنِ کریم میں سوچنے سمجھنے اور غور و فکر کرنے کی بار بار تلقین کی گئی ہے اور مظاہرِ قدرت کو خدا کی نشانیاں بتایا گیا ہے، جن کو دیکھ کر انسان کائنات کے متعلق دُور رس نتائج اخذ کرتا اور خالقِ کائنات کی معرفت حاصل کرتا ہے۔

شارع علیہ السلام نے بھی تحصیلِ علم کو فرض قرار دے کر اور علم کو اپنا ہتھیار بتلا کر امت کے ہر فرد کو غور و فکر کی ترغیب دی۔ اسی ذہنی انقلاب اور توہم پرستی سے آزادی کا نتیجہ تھا کہ قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں نے سیاست اور تمدّن کے علاوہ علم و فن کے میدان میں بھی بڑی فتوحات کیں اور کوئی پانچ سو سال تک علمی دنیا کی رہبری کا فرض انجام دیا

میں نے ایک سابقہ مضمون "Islam's Attitude to Science" میں جو ۱۹۵۸ء میں اسی یونیورسٹی کے زیرِ اہتمام

منعقدشدہ اسلامی مذاکرہ Colloquia میں پیش کیا گیا تھا، بتایا تھا کہ مشاہدے اور نظریے کے امتزاج سے جدید سائنس کی بنیاد درحقیقت مسلم علما ہی نے رکھی ہے اور اب، تو مغربی مؤرخین بھی اس امر کی شہادت دینے لگے ہیں کہ اس اوّلیت کا سہرا مسلمان کے سر ہے۔ علامہ اقبال نے بھی اس حقیقت کو اپنے انداز میں بیان کیا ہے اور اسی کے ساتھ مسلمانوں کے لیے کتاب اور حکمت دونوں کی ضرورت پر زور دیا ہے۔

برگ و ساز ما کتاب و حکمت است
ایں دو قوت اعتبار ملّت است
آں فتوحات جہانِ ذوق و شوق
ایں فتوحات جہان تحت و فوق
ہر دو انعام خدائے لایزال
مومناں را آں جمال است ایں جلال
حکمت اشیا فرنگی زاد نیست
اصل او جز لذّت ایجاد نیست
نیک اگر بینی مسلماں زادہ است
ایں گہر از دست ما افتادہ است
چوں عرب اندر اروپا پرکشاد
علم و حکمت را بنا دیگر نہاد
دانہ آں صحرا نشیناں کاشتند
حاصلش افرنگیاں برداشتند
ایں پری از شیشہ اسلاف ماست
باز صیدش کن کہ او از قاف ماست

(مسافر ۔ صفحہ ۴۰)

اب یہ غور کرنے کی بات ہے کہ اگر مذہب اور سائنس میں کوئی تضاد ہوتا یا عقلِ سلیم کو استعمال کرنے کی ممانعت ہوتی تو قرونِ اولیٰ کے وہ لوگ جو رسولِ کریمؐ صلعم کے زمانے سے قریب تر تھے اور اسلام کی تعلیم سے بخوبی واقف تھے، علم و فن میں اس قدر انہماک کو کیسے گوارا کرتے اور علومِ فطرت خصوصاً ریاضی، ہیئت، طبیعات، اور طب میں اس قدر ترقی کیسے کرتے۔ یہ اسلام ہی کی تعلیم کا نتیجہ اور اس کی پیدا کی ہوئی وسعتِ قلب و نظر

تھی جس کی بدولت مسلمانوں میں یہ ذوق و شوق پیدا ہوا اور انھوں نے علمی تحقیقات اور انکشاف میں اپنے جوہر دکھلائے۔

اس میں شک نہیں کہ اُس دور میں چند لوگ ایسے موجود تھے جو علم و فن کی اس توسیع و اشاعت کے خلاف تھے اور دین کو دنیا سے علیحدہ کر کے دینی معاملات میں تقلید اور روایت پرستی کو نافذ کرنا چاہتے تھے۔ ان لوگوں کا اثر اور رسوخ جب زیادہ ہو گیا تو وقت بوقت بعض اکابرینِ امت نے اس تنگ نظری کا ازالہ کرنے کی کوشش کی۔ ان بزرگوں میں ایک قابلِ قدر مثال امام غزالیؒ کی ہے جنھوں نے اس مسئلے پر کافی غور کیا اور اس کے متعلق ایک متوازن نقطۂ نظر پیش کیا ہے۔ چنانچہ اپنی معرکۃ الآرا تصنیف "احیاء علوم الدین" میں وہ فرماتے ہیں:

"اب اگر یہ پوچھا جائے کہ جب عقل کا یہ حال ہے (یعنی بموجب حدیث شریف، عقل عرش سے بزرگ تر ہے) تو صوفیا عقل اور معقول کو بُرا کیوں کہتے ہیں، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں نے عقل اور معقول کو ان کے اصلی معنی چھوڑ کر مناظرہ اور مجادلہ کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ اس لیے صوفیا نے ان کی مذمت کی ہے۔ ورنہ نورِ بصیرت جس کے ذریعے اللہ تعالےٰ کو پہچانا جاتا ہے اور اس کے رسولوں کی تصدیق کی جاتی ہے، بھلا اس کی مذمت کیسے متصور ہو سکتی ہے۔ اس کی تعریف تو خود اللہ تعالےٰ نے فرمائی ہے اور اگر اسی کی مذمت کی جائے تو پھر تعریف کس چیز کی ہو گی۔ کیونکہ اگر شرع قابلِ تعریف ہے، اس کی درستی کا علم کس چیز سے حاصل ہوتا ہے؟ اگر یہ علم اسی بُری شے یعنی عقل سے ہے کہ جس کا اعتبار نہیں تو پھر شریعت بھی بری ٹھہرتی ہے۔ اور اگر کوئی کہے کہ شریعت کی صحت کا علم عین الیقین اور نورِ ایمان سے حاصل ہوتا ہے تو اس قول پر لحاظ کرنا چاہیئے، اس لیے کہ ہماری مراد جو کچھ عقل سے ہے وہی صفت باطنی کہ جس سے آدمی حیوانوں سے ممتاز ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ اسی کے باعث امور کی حقیقتیں معلوم کرتا ہے۔" (احیاء العلوم، صفحہ ۱۱۷)

احیاء العلوم کے علاوہ اپنی دوسری کتاب "المنقذ من الضلال" میں جو ایک طرح سے ان کی علمی اور روحانی سوانح حیات ہے، امام غزالیؒ نے اس امر پر نہایت صراحت کے ساتھ روشنی ڈالی ہے کہ مذہب اور علم و حکمت میں کوئی تضاد یا اختلاف نہیں ہے۔ اس کتاب سے ایک دو اقتباس یہاں درج کیے جاتے ہیں:-

"نشات من صدیق الاسلام جاھل، ظن ان الدین ینبغی ان ینصر بانکار کل علم منسوب الیھم۔ فانکر جمیع علومھم وادعی جھلھم فیھا۔ حتی انکر قولھم فی الکسوف والخسوف، وزعم ان ما قالوا علی خلاف الشرع فلما فرغ ذالک سمع من عرف ذالک بالبرھان القاطع لم یشک فی برھانہ، لکن اعتقد ان الاسلام مبنی علی الجھل وانکار البرھان القاطع، فاذ داد الفلسفۃ

حبا ولا الاسلام بغضا۔ وقد عظم علی الدین جنایۃ من ظن ان الاسلام ینصر بہ انکار ھذہ العلوم۔ ولیس فی الشرع تعرض لھذہ العلوم بالنفی والاثبات ولا فی ھذہ العلوم تعرض الامور الدینیہ۔ وقولہ علیہ السلام ان الشمس والقمر آیتان من آیات اللہ تعالیٰ۔ لا ینخسفان لموت احد ولا لحیاتہ فاذا رایتم ذالک فافزعوا الی ذکر اللہ تعالیٰ والی الصلوات۔ لیس فی ھذا ما یوجب انکار علم الحساب المعروف بمسیر الشمس والقمر واجتماعھا او مقابلتھا علی وجہ مخصوص۔" (المنقذ من الضلال، صفحہ ۲۵)

اس عبارت کا لفظی ترجمہ یوں ہوگا :

" دُوسری آفت اس شخص کی پیدا کردہ ہے جو اسلام کا نادان پیرو ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ مذہب کو بچانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہر علم علم و حکمت کا انکار کیا جائے اور ان علوم کو جہل قرار دیا جائے اس معاملے میں اس شخص کا غلو اس درجے ہوتا ہے کہ وہ چاند گرہن اور سُورج گرہن کے نظریے کا بھی انکار کرتا ہے اور اس زعم میں مبتلا ہوتا ہے کہ ان گرہنوں کے متعلق جو کچھ حکمائے نے کہا ہے وہ خلافِ شرع ہے۔ جب اس شخص کی باتیں کوئی ایسا آدمی سنتا ہے جو ان علوم سے قطعی دلائل کی بنا پر واقف ہوتا ہے، تو چونکہ وہ اپنی دلیلوں پر شبہ نہیں کر سکتا، اس لیے سمجھتا ہے کہ اسلام کی بنیاد ہی جہالت اور قطعی دلائل سے انکار پر ہے۔ اس طرح وہ خود اسلام ہی سے متنفر ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ایسا مذہبی شخص جو یہ سمجھتا ہے کہ مذہب کو ان علوم کے انکار سے تقویت پہنچتی ہے۔ دراصل مذہب کے حق میں ایک زبردست جرم کا مرتکب ہوتا ہے۔ حالانکہ شرع میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو ان علوم کے مقابل منفی یا مثبت طور پر ہو۔ اسی طرح ان علوم میں بھی کوئی ایسی چیز نہیں ہے، جو مذہب کے خلاف ہو۔ چنانچہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا ہے : " سُورج اور چاند اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں۔ انھیں نہ تو کسی کے مرنے پر گرہن لگتا ہے اور نہ جینے پر۔ جب تم ان مظاہر قدرت کو دیکھو تو خدا کو یاد کرو۔ اس حدیث میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جو ان علوم سے انکار کرنا سکھائے۔"

چونکہ یہ ایک نہایت اہم نکتہ ہے، اس لیے میں امام غزالیؒ کا ایک اور مقولہ نقل کرتا ہوں اور پھر اس کا ترجمہ درج کرتا ہوں :۔

" واما علم طبیعات فھو بحث عن عالم السمٰوات وکواکبھا وما تحتھا من الاجسام المفردۃ کالماء والھواء والتراب والنار۔ ومن الاجسام

المركبة كالحيوان والنبات والمعادن وعن اسباب تغيرها واستحالتها وامتزاجها - وذالك يضاهي بحث الطب عن جسم الانسان واعضائه الرئيسه والخادمة واسباب استحالة مزاجها - وكما ليس من شرط الدين انكار علم الطب فليس من شرطه ايضاً انكار ذالك العلم "

(المنقذ من الضلال، صفحہ ۲۷)

یعنی علم طبیعات میں آسمانوں اور ستاروں سے، ان کے نیچے پائے جانے والے مفرد اجسام مثلاً پانی، ہوا، مٹی اور آگ سے اور مرکب اجسام مثلاً حیوانات، نباتات اور جمادات سے اور ان میں پیدا ہونے والے تغیر و تبدل اور ترکیب و اجتماع کے اسباب سے بحث کی جاتی ہے۔ طبعی علوم کی یہ بحث علم طب کی اس بحث کے مماثل ہے، جو اس علم میں انسان کے جسم اور اس کے اعضائے رئیسہ اور ثانیہ سے اس کے مزاج میں تبدیلیوں سے کی جاتی ہیں۔ پس جس طرح مذہب کے ماننے کے لیے ایسی کوئی شرط نہیں ہے کہ علم طب سے انکار کیا جائے، اسی طرح یہ بھی شرط نہیں ہے کہ علوم طبعی سے انکار کیا جائے "۔

مَیں نہیں سمجھتا کہ مذہب اور سائنس میں کوئی تضاد نہ ہونے کے متعلق اس سے زیادہ واضح طور پر کچھ کہا جا سکتا ہے، جیسا کہ امام غزالیؒ نے کہا ہے۔ اگرچہ ان کی یہ تحریریں گیارہویں صدی میں دنیا کے سامنے پیش کر دی گئی تھیں لیکن مغرب کے عہد وسطیٰ میں کلیسائیت کا وہی تسلط برقرار رہا اور امام موصوف کی تشریحات کے صدیوں بعد بھی گلیلیو جیسے عظیم سائنس دان کو محض حرکتِ زمین کے متعلق تعلیم دینے پر سزا کا مستحق قرار دیا گیا کیونکہ یہ تعلیم کلیسا کے عقیدے کے خلاف تھی۔ اسی کلیسائی عقیدے کا اثر تھا کہ کیپلر جیسے ماہرِ فلکیات نے، جس کے مشاہدات نیوٹن کے قانون تجاذب کی بنیاد سمجھے جاتے ہیں، سیاروں کی حرکت کی توجیہہ یوں کی کہ ہر سیارے میں ایک رُوح ہوتی ہے، جو اس کو سورج کے گرد گردش دیتی ہے۔ غرض سائنس کو اسی اندیشے سے مسخ کیا جاتا رہا کہ کہیں وہ مذہب کی مدِّ مقابل نہ ہو جائے۔

پھر ظاہر ہے کہ اس شدید مذہبی تعصب کا ردِّ عمل بھی شدید ہونا لازمی تھا۔ چنانچہ جب یورپ کی نشاۃِ ثانیہ کا دور شروع ہوا تو وہاں کے علمی حلقوں میں مادیت اور الحاد کی تحریک زور پکڑتی گئی اور لوگوں نے مذہب کو سائنس کے اصولوں پر پرکھنا اور ان پر پورا نہ اُترنے کے باعث مسترد کرنا شروع کیا۔ جن لوگوں نے مذہب سے قطعی انکار نہیں کیا، انھوں نے بھی اس کو خدا اور بندے کے درمیان ایک خانگی معاملہ قرار دیا، اور دنیاوی معاملات سے اس کو بالکل بے دخل کر دیا۔ اہلِ مغرب کے یہ سائنسی اور فلسفیانہ خیالات ان کے سیاسی غلبہ اور حکومت کے ساتھ ساتھ مشرقی ممالک

میں بھی پھیلتے گئے اوران کی تعلیم اور تہذیب سے متاثر ہوکر برِصغیر کے مسلمانوں میں رائج ہوتے چلے گئے ۔

انیسویں صدی کا یہی آخری زمانہ تھا جب اقبال نے ہوش سنبھالا اور ملتِ اسلامیہ کے نوجوان افراد کو جنھوں نے کسی قدر جدید تعلیم حاصل کی تھی ، مذہب کو عقل کے منافی سمجھ کر اس سے بیگانہ ہوتے ہوئے دیکھا تو وہ ایک حسرت بھرے لہجے میں پکار اُٹھے :۔

خوش تو ہیں ہم بھی جوانوں کی ترقی سے مگر
لبِ خنداں سے نکل جاتی ہے فریاد بھی ساتھ
ہم نے سمجھا تھا کہ لائے گی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ
گھر میں پرویز کے شیریں تو ہوئی جلوہ نما
لے کے آئی ہے مگر تیشۂ فرہاد بھی ساتھ

(بانگِ درا صفحہ ، ۲۴۳)

تھوڑی بہت نئی تعلیم حاصل کرکے گمراہی اور مادہ پرستی میں مبتلا ہونے والے نوجوانوں کی اصلاح و تربیت کے لیے اقبال نے ضروری سمجھا کہ اس زہرِ قاتل کا جو ملت کے جسدِ اجتماعی میں سرایت کرتا جا رہا ہے ، تریاق پیش کریں اور عقلِ محض کی خامیوں اور کمزوریوں کو اور اس کے ذریعے حاصل ہونے والے علم اور تجربے کے نقائص اور کوتاہیوں کو واضح کریں ، تاکہ یہ علم کہیں حجابِ اکبر نہ بن جائے ۔

اس کے علاوہ جس جدید مغربی تہذیب کا مشاہدہ انھیں اپنے قیامِ مغرب کے زمانے میں ہوا تھا اور جس کے دلدادہ ہمارے نوجوان ہوتے جا رہے تھے ، چونکہ اس کی بنیاد سائنس اور ٹیکنالوجی یعنی علومِ عقلی پر رکھی گئی تھی اور چونکہ اس تہذیب میں مذہب اور روحانیت کا کوئی شائبہ نہیں ، اس لیے اقبال نے اس ابتدائی دور میں یہ ضروری سمجھا کہ عقل اور عشق کا موازنہ کرکے عقل و خرد کی کوتہ دامنی کا پردہ چاک کیا جائے ۔ یہاں یہ نکتہ بیان کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اقبال عام طور پر عشق ، جذب اور جنوں کے اصطلاحی الفاظ بفحوائے " الذین آمنوا اشد حباللہ" ایمان اور یقین کے مفہوم کو ظاہر کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں اور اپنی ابتدائی نظموں میں جا بجا عقل و خرد اور عشق و جنوں کا فرق اور تفاوت پیش کرتے ہیں ۔ چنانچہ اس قبیل کی پہلی نظم بانگِ درا میں " عقل و دل " کے عنوان سے ملتی ہے جس میں عقل ، دل کے سامنے یوں لاف زنی کرتی ہے کہ :۔

ہوں زمین پر ، گزر فلک پہ مرا دیکھ تو کس قدر رسا ہوں میں
ہوں مفسّرِ کتابِ ہستی کی مظہرِ شانِ کبریا ہوں میں

یہ سُن کر دل جواب دیتا ہے کہ تو جو کچھ کہتی ہے وہ سچ ہوگا لیکن ذرا میری شان بھی تو دیکھ کہ :-

راز ہستی کو تو سمجھتی ہے
اور آنکھوں سے دیکھتا ہوں مَیں
علم تجھ سے تو معرفت مجھ سے
تو خدا جُو ، خُدا نما ہوں میں
تو زمان و مکاں سے رشتہ بہ پا
طائر سدرہ آشنا ہوں میں
کس بلندی پہ ہے مقام مرا
عرش ربِّ جلیل کا ہوں میں

(بانگِ درا ص ۲۸-۲۹)

عقل اور عشق میں یہی فرش و عرش یعنی زمین و آسمان کا فرق ہے جو اقبال نے اپنی دوسری نظموں میں بھی پیش کیا ہے۔ چنانچہ رموزِ بے خودی میں حریت اسلامیہ اور حادثۂ کربلا کا راز فاش کرتے ہوئے وہ بتاتے ہیں کہ :-

مومن از عشق است و عشق از مومن است
عشق را ناممکن ما ممکن است
عقل در پیچاک اسباب و علل
عشق چوگان باز میدانِ عمل
عقل را سرمایہ از بیم و شک است
عشق را عزم و یقین لاینفک است
عقل محکم از اساس چون و چند
عشق عریاں از لباس چون و چند

(رموزِ بے خودی ص ۱۲۵)

اس امر کا انھوں نے اپنے خطبات میں اس طرح اظہار کیا ہے کہ " تصورات کا ذریعہ حقیقت تک پہنچنے کا کوئی سنجیدہ ذریعہ نہیں لہٰذا اگر تصورات کی مدد سے حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کی گئی تو یہ کوشش کچھ بہت زیادہ مؤثر ثابت نہ ہوگی۔ سائنس کو اس امر سے کوئی غرض نہیں کہ الکٹرون کا وجود حقیقی ہے یا غیر حقیقی

ہوسکتا ہے کہ الکٹرون محض ایک علامت یا قرارداد ہو۔ یہ صرف مذہب ہی ہے جو حقیقت کے متعلق سنجیدہ طور پر بحث کرتا ہے۔ ایک اعلےٰ درجے کی واردات کی حیثیت سے مذہب کا یہ کام ہے کہ وہ فلسفۂ الٰہیات کے تصوّروں کی تصحیح کرے یا کم از کم اس عقل محض کو مشتبہ ثابت کرے جو اس قسم کے تصوروں کی تشکیل کرتی ہے۔ سائنس کے لیے تو یہ ممکن ہے کہ مابعد الطبیعات کو سرے سے نظر انداز کر دے یا Lange کی طرح اس کو ایک جائز قسم کی شاعری سمجھے یا Nietzsche کے بقول اس کو سن رسیدہ لوگوں کا کھلونا بنا دے۔ لیکن ایک مذہبی عالم جو اشیاء کی ترکیب میں اپنا مقام اور مرتبہ تلاش کر رہا ہو اس بات پر قانع نہیں ہوسکتا کہ صرف اشیاء کے طرزِ عمل سے واقفیت حاصل کرے۔ جہاں تک حقیقتِ مطلقہ کی ماہیت کا تعلق ہے۔ سائنس کو اس سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ اس کے برعکس چونکہ خودی بذاتِ خود زندگی اور اس کے واردات یعنی مشاہدات اور تجربوں کے حصول اور جذب و اکتساب کا ایک مرکز ہے، اس کی ہستی کا دارو مدار ہی اس پر ہے"۔

(خطبات صفحہ ۱۸۴ - ۱۸۵)

بانگِ درا اور مثنوی اسرار و رموز تک تو اقبال نے کبھی کبھی اس موضوع پر اظہارِ خیال کیا ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پیامِ مشرق کی تصنیف کے زمانے میں زیادہ تر یہی موضوع ان کے پیشِ نظر رہا ہے اور کئی مقامات پر مختلف پیرایوں میں ذکر و فکر، خبر و نظر اور عقل و عشق کا مقابلہ اور موازنہ کیا ہے۔ چنانچہ نقشِ فرنگ، جلال و ہیگل، جلال و گوئٹے، پیغامِ برگسان وغیرہ نظموں کا موضوع ہی یہ ہے۔ اس موقع پر میں ان کی صرف ایک نظم 'جلال اور گوئٹے' پیش کرنے پر اکتفا کروں گا، جس میں انھوں نے مولانا روم کے ایک شعر کی تضمین کرتے ہوئے باغِ ارم میں گوئٹے کو مولانا کی خدمت میں پیش کیا ہے اور بتایا ہے کہ کس طرح مولانا روم جرمن شاعر کی مشہور کتاب 'فاؤسٹ' کی پوری حکایت اپنے ایک نہایت فصیح و بلیغ شعر میں ادا کر دیتے ہیں۔ جیسا کہ خود اقبال نے اپنے تشریحی نوٹ میں بیان کیا ہے، اس ڈرامے میں شاعر گوئٹے نے حکیم فاؤسٹ اور ابلیس کے عہد و پیمان کی قدیم روایت کے پیرائے میں انسان کے امکانی نشوونما کے تمام مدارج نہایت خوبی اور کمالِ فن کے ساتھ ادا کیے ہیں۔ اقبال کی یہ مختصر نظم الفاظ و معانی کا شاہکار ہے اور ہمارے پیشِ نظر موضوع پر بڑی خوبی سے روشنی ڈالتی ہے:-

نکتہ دان المنی را در ارم

صحبتے افتاد با پیرِ عجم

شاعرے کو، ہمچو آن عالی جناب

نیست پیغمبر ولے دارد کتاب

خواند بر دانائے اسرارِ قدیم
قصۂ پیمان ابلیس و حکیم
گفت رومی اے سخن را جان نگار
تو ملک صید استی و یزداں شکار
فکر تو در کنج دل خلوت گزید
این جہان کہنہ را باز آفرید
سوز و ساز جاں بہ پیکر دیدۂ
در صدف تعمیر گوہر دیدۂ
ہر کسے از رمزِ عشق آگاہ نیست
ہر کسے شایان این درگاہ نیست
داند آں کو نیک بخت و محرم است
زیرکی زابلیس و عشق از آدم است "

(پیامِ مشرق، صفحہ ۲۴۶)

اقبال پر بعض لکھنے والوں نے ان کے ساتھ سخت ناانصافی کی ہے اور ان کی اسی قبیل کی نظموں اور اشعار کو پیش کیا ہے، جس سے ان کے اصلی خیالات کے متعلق غلط تاثر پیدا ہوتا ہے۔ جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے، جدید تہذیب کی ظاہری چمک دمک سے مرعوب ہو کر اپنے شعار ملی سے غفلت یا انکار کرنے والوں کو جھنجھوڑنے کے لیے اقبال نے عقل کے محدود ہونے کا بیان ضروری سمجھا تھا۔ لیکن اس سے ان کا مقصد ہرگز یہ نہیں تھا کہ عقل و فکر کی تنقیص کی جائے۔ ان کے کلام میں بے شمار مقامات ایسے ہیں جہاں انھوں نے عقل و خرد اور اس پر مبنی علم و حکمت کی اہمیت جتائی ہے اور مسلمانوں کو تاکید کی ہے کہ وہ تسخیر فطرت کی خاطر علم و فن میں کمال حاصل کریں اور اس طرح ملتِ اسلامیہ کو وسیع اور مستحکم بنائیں۔ اپنے خطبات میں تو انھوں نے خاص طور پر بتایا ہے کہ نہ صرف مذہب اور سائنس میں کسی قسم کا تضاد نہیں ہے بلکہ ان میں یک گونہ مطابقت بھی پائی جاتی ہے۔ اس مضمون کے بقیہ حصے میں اسی اجمال کی تفصیل پیش کی جائے گی۔

اس کی تمہید کے طور پر میں چاہتا ہوں کہ " بانگِ درا " کی ایک نظم جس کا عنوان ہی 'مذہب' ہے اور جو مرزا بیدل کے ایک شعر کی تضمین پر مشتمل ہے، آپ کی خدمت میں پیش کروں۔ کہتے ہیں :-

تعلیم پیرِ فلسفۂ مغربی ہے یہ
ناداں ہیں جن کو ہستیٔ غائب کی ہے تلاش
پیکر اگر نظر سے نہ ہو آشنا تو کیا
ہے شیخ بھی مثال برہمن صنم تراش
محسوس پر بنا ہے علوم جدید کی
اس دور میں ہے شیشہ عقائد کا پاش پاش
مذہب ہے جس کا نام وہ ہے اک جنونِ خام
ہے جس سے آدمی کے تخیل کو انتعاش
کہتا مگر ہے فلسفۂ زندگی کچھ اور
مجھ پر کیا ہے مرشدِ کامل نے راز فاش
"باہر کمال اندکے آشفتگی خوش است
ہر چند عقل کل شدۂ بے جنوں مباش"

(بانگِ درا صفحہ ۲۷۷)

ہوش و خرد اور جذب و جنوں کا یہی امتزاج اقبال کے فلسفے کا خصوصی عنصر ہے اور ان کے کلام میں شروع ہی سے اس کا اشارہ ملتا ہے۔ چنانچہ بانگِ درا کا ایک شعر ہے :-

الٰہی عقلِ خجستہ پے کو ذرا سی دیوانگی سکھا دے
اسے ہے سودائے بخیہ کاری، مجھے سرِ پیرہن نہیں ہے

(صفحہ ۱۴۳)

اسی طرح ضربِ کلیم میں عقل اور دین کے عنوان سے فرماتے ہیں :-

وہ علم اپنے بتوں کا ہے آپ ابراہیم
کیا ہے جس کو خدا نے دل و نظر کا ندیم
زمانہ ایک حیات ایک کائنات بھی ایک
دلیل کم نظری قصۂ جدید و قدیم
چمن میں تربیتِ غنچہ ہو نہیں سکتی
نہیں ہے قطرۂ شبنم اگر شریکِ نسیم

وہ علم کم بصری جس میں ہم کنار نہیں
تجلّیات کلیم و مشاہدات حکیم

(ضربِ کلیم، صفحہ ۱۹)

اسی نکتے کی تشریح کرتے ہوئے وہ بتاتے ہیں کہ مسلمان کی زندگی میں 'نہایت اندیشہ' اور 'کمالِ جنوں' دونوں پائے جانے چاہئیں اور فنائے جنوں کو قامتِ خرد پر موزوں کرنا چاہیئے۔ اس کائنات میں ہم جو کچھ دیکھتے ہیں وہ نورِ حق کی وساطت ہی سے دیکھتے ہیں اور حکمت اشیاء جو اسرارِ حقیقت کو نمایاں کرتی ہے اس کی بنیاد قرآنی حکم "انظر" ہی پر رکھی گئی ہے۔ جاوید نامہ میں اس حقیقت کو وہ نہایت مؤثر انداز میں پیش کرتے ہیں :۔

علم تا از عشق برخوردار نیست
جُز تماشہ خانۂ افکار نیست

این تماشہ خانہ سحر سامری است
علم بے رُوح القدس افسونگری است

گفت حکمت را خدا خیرِ کثیر
ہر کجا این خیر را بینی بگیر

چشم او بر واردات کائنات
تا بہ بیند محکمات کائنات

دِل اگر بندد بہ حق پیغمبری است
ورز حق بیگانہ گردد کافری است

خوشتر آن باشد مسلمانش کنی
کشتۂ شمشیر قرآنش کنی

علم بے عشق است از طاغوتیاں
علم با عشق است از لاہوتیاں

بے محبّت علم و حکمت مردۂ
عقل تیرے بر ہدف ناخوردۂ

کور را بیندہ از دیدار کن
بولہب را حیدر کرار کن"

(جاوید نامہ، صفحہ ۸۲)

اقبال کے منظوم کلام کے بے شمار اشعار میں سے یہاں صرف چند شعر پیش کئے گئے ہیں جن میں انھوں نے ذکر و فکر کو ایک دوسرے کے ساتھ مربوط رکھنے کی تلقین کی ہے۔ لیکن شرح و بسط کے ساتھ مدلل پیرائے میں اس حقیقت کا اظہار انھوں نے اپنے خطبات میں کیا ہے۔ اور اب میں انہی خطبات کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

مذہب اور سائنس میں عدم تضاد بلکہ یک گونہ مطابقت کے متعلق اقبال کے خیالات کا جائزہ لینے سے پیشتر یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ طبیعی سائنس کے جدید بنیادی تصوروں کی تشریح کر دی جائے جن کو اقبال نے جا بجا اپنے خطبات میں استعمال کیا ہے۔

جب نیوٹن نے سترھویں صدی کے اواخر میں قانون تجاذب کا انکشاف کیا اور علم حرکت کی تدوین کی تو ان قوانین کا اطلاق نہ صرف روئے زمین پر پیش آنے والے واقعات پر کیا گیا بلکہ نظام شمسی کے سیاروں اور دوسرے مظاہر پر بھی اس کو وسعت دی گئی اور مشہور فرانسیسی ریاضی دان لاپلاس نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ اس کائنات کی میکانکس ایک ہی ہو سکتی ہے اور اس میکانکس کو نیوٹن نے دریافت کر لیا ہے۔ اس کا مطلب یہ لیا گیا کہ اب اس سے آگے کسی اور کے لیے کچھ کرنا باقی نہیں ہے۔ انیسویں صدی میں اس میکانکس کی جڑیں اسقدر مضبوط اور وسیع ہو گئیں کہ نہ صرف طبیعی علوم میں بلکہ حیاتیاتی علوم میں بھی ان کا اطلاق کرنے کی کوشش کی جانے لگی۔ علوم فلکیات، طبیعات، کیمیا اور حیاتیات میں اس غیر معمولی ترقی کی وجہ سے مادیت اور دہریت کو زبردست تقویت پہنچی اور ظاہر بیں لوگوں نے یہ سمجھنا شروع کیا کہ سائنس نے مذہب کی بنیادیں کھوکھلی کر دی ہیں۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کائنات میں شروع سے آخر تک علت و معلول کا ایک سلسلہ کارفرما ہے جس کی بنا پر اس کی تخلیق بھی ہوئی اور تشکیل بھی ہو رہی ہے نہ کسی خالق کی ضرورت ہے نہ قیوم کی۔

علمی دنیا کا یہ بھی ایک عجیب اتفاق ہے کہ جب نیوٹن کے نظریوں پر مبنی طبیعیات انیسویں صدی کے آخری حصے میں اپنے عروج پر پہنچ رہی تھی، عین اسی زمانے میں پے در پے چند ایسے تجربے اور مشاہدے ہوئے کہ خود اس علم کی بنیادیں ہی ہل گئیں اور علم طبیعیات میں ایک ہمہ گیر انقلاب رونما ہوا۔ مادہ اور توانائی، ذرہ اور موج، جوہر اور عنصر، زمان و مکان اور علت اور معلول جیسے بنیادی تصور ہی سرے سے بدل گئے اور خود قوانین قدرت کا بھی ایک نیا مفہوم لیا جانے لگا۔ ان تغیرات نے نیوٹن اور میکسول کی طبیعیات کی بجائے اس جدید طبیعیات کی تشکیل کی، جس کی بنیاد کوانٹم اور اضافیت کے نظریوں پر رکھی گئی ہے۔ ان نئے تصورات کی کماحقہ، تشریح کے لیے تو ایک پوری کتاب درکار ہوگی لیکن ان کو کسی حد تک بتائے بغیر آگے بڑھنا بھی مشکل ہے۔ کیونکہ اس مضمون کا دارومدار ہی ان تغیرات پر ہے جو جدید سائنس میں رونما ہوئے ہیں۔

انیسویں صدی کی طبیعیات میں مادہ اور توانائی ایک دوسرے کے متضاد تصور تھے۔ مادہ کے متعلق سمجھا جاتا تھا کہ

وہ ایک مجسم شے ہے، جو ایک محدود فضا کو بلا شرکت غیرے احاطہ کرتی ہے، جس کو کم و بیش یا معدوم نہیں کیا جا سکتا۔ جب کوئی مادی شے حرکت کرتی ہے تو وہ ایک ہی خط میں کسی ذرّے کی طرح حرکت کرتی ہے۔ آواز یا روشنی کی موجوں کی طرح پوری فضا میں نہیں پھیل جاتی۔ اس کے برخلاف روشنی اور توانائی کے متعلق یہ خیال تھا کہ نہ تو وہ کوئی مجسم شے ہے اور نہ کسی محدود فضا کو بلا شرکت غیرے گھیرتی ہے۔ اس کا کوئی وزن نہیں ہوتا اور وہ ذرّے کی طرح حرکت نہیں کرتی بلکہ موجوں کی شکل میں آگے بڑھتی ہے۔

جدید طبیعیات میں مادہ اور توانائی کا یہ اختلاف ختم ہو گیا ہے۔ اور تجربوں سے ثابت ہو گیا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کی مختلف شکلیں ہیں۔ کبھی مادہ توانائی میں تبدیل ہو جاتا ہے اور کبھی توانائی مادہ میں۔ جب کوئی ذرّہ حرکت کرتا ہے تو اس کے وزن میں اضافہ ہو جاتا ہے اور جب وہ ذرہ ساکن ہوتا ہے تو اس کا وزن کم ہو جاتا ہے۔ ایک مادّی شے کبھی ذرّے کی طرح ایک خط میں اور کبھی موجوں کی طرح پھیلتی ہوئی آگے بڑھتی ہے۔ مادہ کے توانائی میں منتقل ہونے کا یہی اصل اصول ہے جس کی بنا پر جوہری بم بنایا گیا ہے۔

جوہر یا atom کے متعلق ۱۸۹۵ء تک سمجھا جاتا تھا کہ وہ مادّہ کا سب سے بڑا چھوٹا ذرّہ ہے جس کی مزید تقسیم نہیں کی جا سکتی۔ لیکن اس صدی کے آغاز میں پتہ چلا کہ ہر جوہر کے اندر بہت سے دوسرے ذرّے ہوتے ہیں جو تین قسم کے اجزاء یعنی الکٹرون، پروٹون اور نیوٹرون پر مشتمل ہوتے ہیں جوہر کا مادہ مسلسل پھیلا ہوا نہیں ہوتا بلکہ یہ ذرے اس کے اندر نظام شمسی کی طرح ترتیب دیئے ہوئے ہوتے اور حرکت کرتے رہتے ہیں۔ ہر جوہر کا مرکزی حصّہ جس کو Nucleus کہا جاتا ہے۔ اس کی ساری توانائی اور مادے کا مرکز ہوتا ہے اور اس کی شکست و ریخت سے جوہر کی ماہیّت بھی بدل جاتی ہے اور جوہری توانائی بھی حاصل ہوتی ہے۔

کیمیائی عناصر سے متعلق سابقہ تصوّر یہ تھا کہ وہ ایک خاص قسم کے مادّے سے متعلق ہوتے ہیں اور ان کی ہیئت اور ماہیت ہمیشہ ایک ہی ہوتی ہے، جیسے ہائیڈروجن یا آکسیجن یا سوڈیم وغیرہ۔ چند سال قبل تک خیال تھا کہ ایسے کیمیائی عنصروں کی تعداد ۹۲ ہے اور ایک عنصر کو دوسرے عنصر میں تبدیل کرنا ہی امر محال ہے۔ جس کی تلاش میں ازمنۂ وسطیٰ میں متعدد کیمیاگروں نے اپنی عمریں ضائع کی تھیں۔ لیکن آج کل یہ کیمیاگری لیبوریٹری میں ہر وقت کی جا رہی ہے اور بعض عناصر میں قدرتی طور پر بھی ہوتی رہتی ہے۔ ایک عنصر کی مختلف شکلیں ہوتی ہیں جن کو Isotope کہا جاتا ہے اور لیبوریٹری میں مصنوعی طور پر Isotope تو کیا نئے عنصر بھی بنائے جا رہے ہیں اور گذشتہ چند سال میں ۱۲ سے زیادہ نئے عنصر یورینیم کے اوپر بنائے جا چکے ہیں۔

زمان و مکاں کے متعلق جدید تصور کو میں نے تفصیل کے ساتھ اپنے سابقہ مضمون میں پیش کیا ہے اور اس لیے اس کو یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں۔

مذکورہ بالا بنیادی تصورات کے بدلنے کی وجہ سے علت و معلول کے منطقی مفہوم میں بھی فرق آگیا ہے۔ نیوٹن کی میکانکس کا ایک اہم مسئلہ یہ تھا کہ اگر کسی شے کی موجودہ حالت معلوم ہو تو اس کی سابقہ یا آئندہ حالت قطعی طور پر متعین ہو جائے گی اور محض قوانینِ حرکت کی بنا پر علم ریاضی کی مدد سے اس کی تمام حالتوں کو ازازل تا بہ ابد معلوم کیا جا سکتا ہے۔ سائنس کا یہی مسئلہ تھا جو مادہ پرستوں کے لیے حکم فیصل کا کام دیتا تھا اور جس کی بنا پر وہ کسی خالق کائنات کے تصور کو غیر ضروری قرار دیتے تھے۔ کیونکہ ان کے نزدیک کائنات کی حالت ہر لمحہ متعین ہے اور وہ اس کے مطابق خود بخود تشکیل پاتی چلی جا رہی ہے۔

لیکن مادہ اور توانائی اور ذرہ اور موج کی ثنویت (duality) اور زمان و مکاں کی اضافیت کی بنا پر ۱۹۲۷ء میں ہائی زن برگ نے ثابت کیا کہ مظاہرِ فطرت میں تعین یا جبر نہیں بلکہ عدم تعین یا امکان پایا جاتا ہے۔ اور ایک ذرہ کسی وقت بھی بے شمار ممکنہ حالتوں میں سے کوئی ایک حالت اختیار کر سکتا ہے۔ اس طرح قوانینِ قدرت تعینی نہیں بلکہ اوسطی (Statistical) ہو جاتے ہیں، اور انیسویں صدی کی سائنس میں جو کٹر قسم کی مادیت پائی جاتی تھی، باقی نہیں رہتی۔ اسی کے ساتھ آیۂ شریفہ " اللہ نور السموات والارض " کا مفہوم بھی سمجھ میں آنے لگتا ہے کہ جب مادہ اور روشنی میں غیریت نہیں رہی تو مادی اشیا کے خالق کا غیر مادی ہونا خلافِ قیاس نہیں ہو سکتا اور دھریوں کے استدلال میں کوئی جان باقی نہیں رہتی۔

۲۳ - ۱۹۲۲ء کے بعد جب نیلس بوہر کے کوانٹم نظریہ میں یکے بعد دیگرے متعدد غلطیاں اور خامیاں منکشف ہونے لگیں تو ۲۶ - ۱۹۲۵ء میں نئی کوانٹم میکانکس کی بنیاد رکھتے ہوئے ہائی زن برگ اور ڈیراک نے بتایا کہ یہ غلطیاں اس وجہ سے پیدا ہو رہی ہیں کہ سائنس کا مقصد اور اس کا طریق کار صحیح طور پر متعین نہیں کیا گیا۔ سائنس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ وہ مظاہرِ فطرت کی انتہائی حقیقت یا غایت معلوم کرے بلکہ سائنس کا کام صرف یہ ہے کہ ان اشیا اور مظاہر میں باہمی ربط اور تعلق کا پتہ چلائے۔ ڈیراک نے مثال کے طور پر بتایا کہ سائنس میں یہ سوال کرنا بے معنی ہے کہ برق کی حقیقت یا ماہیت کیا ہے، بلکہ صحیح سوال یہ ہوگا کہ قوتِ برق کا عمل کیا ہے۔ اس طرح سائنس کا طریق کار اور دائرۂ عمل نئے سرے سے متعین ہو جاتا ہے اور فلسفہ یا مذہب کے ساتھ کسی تضاد کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

اس سے بھی آگے چلئے تو ہم دیکھیں گے کہ سائنس کے اساسی تصور میں ایک بہت بڑا انقلاب رونما ہوا یہ انقلاب سائنس کے بنیادی قوانین کی تشکیل سے متعلق ہے۔ جیسا کہ عام طور پر معلوم ہے، انیسویں صدی کے ختم تک سائنس کے تمام بنیادی قوانین استقرائی یعنی Inductive طریقے پر اخذ کئے جاتے تھے مثلاً قانون تجاذب ہی کو لیجئے۔ یہ قانون کہ کائنات کے کسی دو مادی اجسام کے درمیان ایک معین مقدار کی تجاذبی قوت پائی جاتی ہے، خاص

مثالوں کی مدد سے اخذ کیا گیا تھا۔ اسی طرح برق و مقناطیس کے قوانین یا روشنی کے منعکس یا منتشر ہونے کے قوانین سب استقرائی تھے۔

لیکن ۱۹۰۵ء میں آئن سٹائن نے اپنے نظریۂ اضافیت کی تشکیل کے لیے جو قانون یا مفروضہ اختیار کیا۔ وہ استقرائی نہیں بلکہ علمیاتی (Epistemological) یا فلسفیانہ ہے۔ اس اصول کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ طبیعی قوانین ایسے ہونے چاہئیں کہ وہ تمام مشاہدین کے لیے غیر متغیر ہوں، خواہ یہ مشاہدین کسی قسم کی حالت حرکت یا سکون میں کیوں نہ ہوں۔ یہ مفروضہ جس پر نظریۂ اضافیت کی تشکیل کی گئی ہے۔ استقرائی نہیں ہے۔ اس طرح عدم تعیّن کا اصول جس پر جدید کوانٹم میکانکس کا دارومدار ہے، استقرائی نہیں بلکہ علمیاتی ہے۔

پروفیسر ایڈنگٹن نے سائنس کی اس نئی تحریک کو ایک بڑی دلچسپ مثال کے ذریعے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ فرض کرو ایک سائنس دان کسی تالاب سے ایک جال کے ذریعے مچھلیاں پکڑ رہا ہے تاکہ ان مچھلیوں کے طول سے متعلق کوئی قانون بنا سکے۔ جب تمام دن کی محنت کے بعد وہ ان مچھلیوں کو جو پکڑی گئی ہیں، ناپتا ہے تو بزعم خود ایک قانون کا انکشاف کرتا ہے کہ اس تالاب میں کوئی مچھلی ایک انچ طول سے کم نہیں ہے۔ اس کے اس فعل کو جب کوئی دوسرا سائنس دان دیکھتا ہے تو اس کو بتاتا ہے کہ تمھیں اس قانون کے اخذ کرنے کے لیے تمام دن اتنی محنت کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ تم محض اپنے جال کو دیکھ کر جس کے تمام خانے ایک انچ طول کے ہیں، شروع ہی میں یہ نتیجہ اخذ کر سکتے تھے کہ اس جال سے کوئی ایسی مچھلی نہیں پکڑی جا سکتی جس کا طول ایک انچ سے کم ہو۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ قوانینِ فطرت کی تشکیل کے لیے علم کی نوعیت اور علم حاصل کرنے کے طریقوں پر غور کر کے استقرائی قوانین کی بہ نسبت زیادہ دور رس اور دیرپا قانون بنائے جا سکتے ہیں۔ کیونکہ استقرائی قوانین تو ایک بھی مخالف مثال کی بنا پر غلط ثابت ہو سکتے ہیں، جیسا کہ نیوٹن کے قانونِ تجاذب کے متعلق معلوم ہوا کہ سیارہ عطارد کا مدار اس قانون کی بنا پر غلط حاصل ہوتا ہے تو اس قانون کو ترک کر دینا پڑا۔

سائنس کی بنیادوں میں ان جدید تبدیلیوں سے واقف ہونے کے بعد اب اقبال کے خیالات کو سمجھنے میں کچھ سہولت ہو گی۔